

”عرفان کے دفتر جاتا ہوں۔ وہاں سے پتہ چلے گا کہ صحیح خبر کیا ہے؟“  
”پھر جاؤ اور معلوم کر کے آؤ۔“

rstے میں جو بھی ملا، جس سے بھی پوچھا وہ اتنا ہی باخبر اور اتنا ہی بے خبر تھا جتنا میں تھا۔  
 واضح خبر کسی کے پاس نہیں تھی۔ سب کو پتہ تھا کہ یہ کچھ ہو گیا ہے اور کسی کو اعتیار نہیں آ رہا تھا۔

اعتبار اور بے اعتباری کے درمیان طالعوں میں نے گھر سے شیراز ہند کے رستے میں کتنی مرتبہ اس نبہر کو افواہ جانا اور کتنی مرتبہ اس افواہ کو بخوبی۔

میر قیاس تھا کہ عرفان اس وقت شیراز میں ہو گا۔ وہاں موجود تھا۔  
”عرفان! دفتر سے آ رہے ہو؟“

”ہاں! باخبر لوچھو گے؟“  
”ہاں!“

”مت پوچھو! صحیح صورت حال کا کسی کو پتہ نہیں ہے۔ ہم نے ڈھاکہ سے رابطہ قائم کرنے کی بہت کوشش کی، نہیں فاهم ہوا۔“

”پتہ نہیں زوار غریب کا کیا حال ہو گا؟“

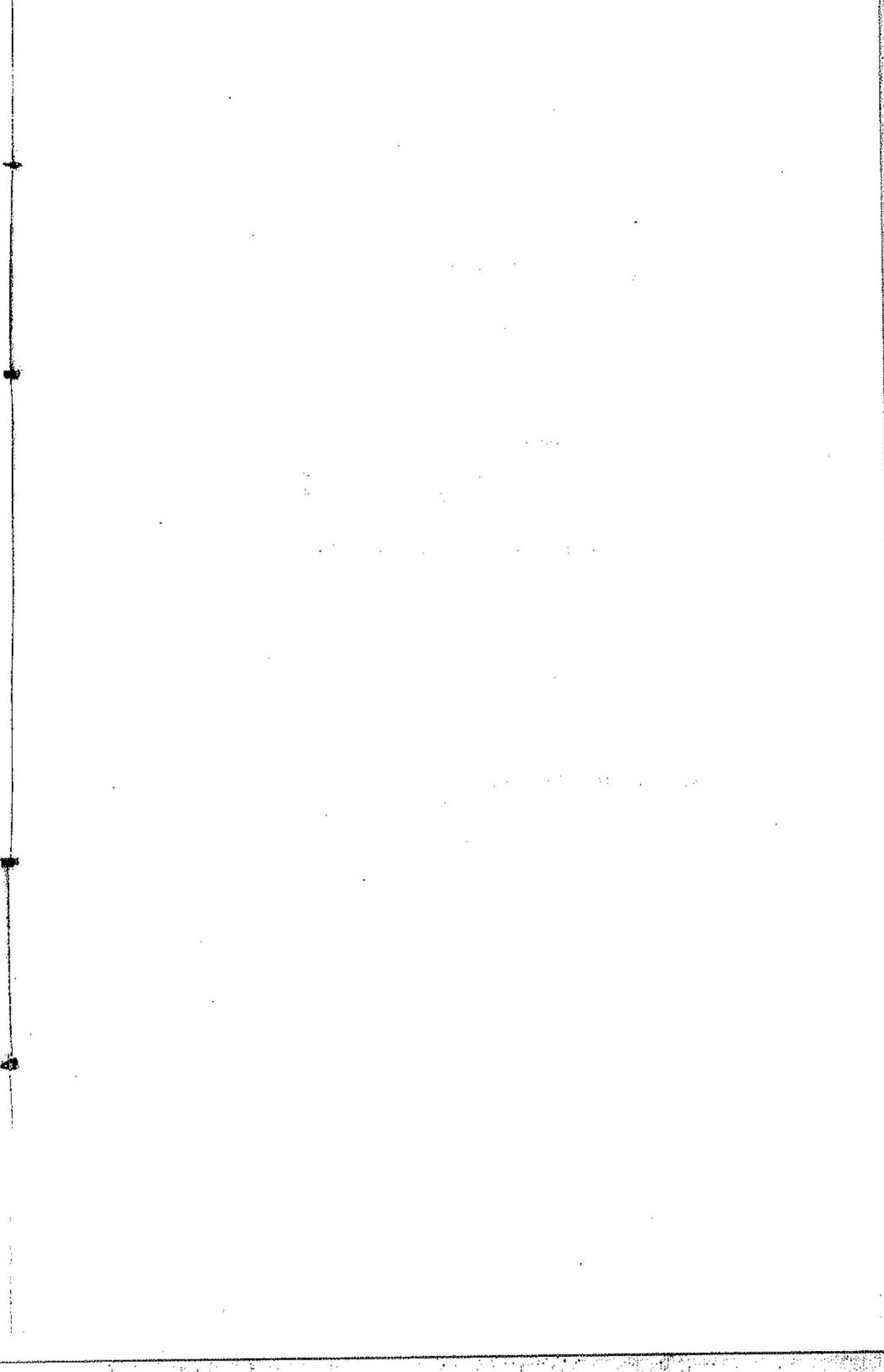
”یہ لوگ گورنر ہاؤس سے انٹر کون میں منتقل ہو گئے ہیں۔“

”اویسری امی اپنی ہیں کے لئے پریشان ہیں۔“

”پریشان ہوتا چاہیتے، مگر کیا ہو سکتا ہے؟“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ میں چپ ہو گیا۔

شیراز اس وقت بھرا ہوا تھا لگوئی چائے نہیں پی رہا تھا۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ کیا پوچھ رہے تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے جو وہ جانتے تھے۔  
مانچکے تھے، ماننے سے انکار کر رہے تھے۔



اس وقت وہ سارا پنی ٹانگوں میں تھا۔ وہ کچلے چلتے کتنا کچھ سوچتا تھا اور سوچتے سوچتے کہاں کہاں نکل جاتا تھا، اس وقت صرف اور بخض چل رہا تھا۔ تیر تیز اُٹھتے قدم، تو قدموں کے شور میں کمان پڑی آواز سنائی تھیں دے رہی تھی یا شاید اور کوئی آواز ہی نہیں تھی۔ وہ غالی شریں آکیلا چل رہا تھا اور دو قدموں کی آہٹ سے پوری فضا کو سچ رہی تھی۔ ان دو قدموں کے شور میں رکشا کا شور بھی دب گیا تھا کہ جب وہ بالکل پڑا برا گئی اور پہاڑ اُکھا آہستہ آہستہ چلنے لگی تب اسے پتہ چلا رکشا خالی تھا اور رکشا والا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہیں۔“ اس نے کہا اور رکشا والے نے رکشا کی رفتار تیز کی اور اگے بڑھ گیا۔ جب مجھے واقعی کہیں جانا ہوتا ہے تو رکشا والے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں، کوئی نہیں رکتا۔ اور کچ جب مجھے کہیں نہیں جانا تو قدم قدم پر غالی رکشا نظر آ رہی ہے اور مجھے دعوت دے رہی ہے، میںے آج شریں میں آکیلا سواری ہوں۔ اس نے نظر اٹھا کر اس پاس دیکھا، پھر سمنے دوڑنک نظر ڈالی۔ اسے لگا کہ اس پاس اور دوڑنک کوئی نہیں ہے۔ لوگ کہاں گئے؟ اس نے پھر ایک مرتبہ قریب دور کا جائزہ لیا۔ بہاں تھاں کوئی ٹوٹی کھڑی ہوئی یا آہستہ آہستہ چلو ہوئی نظر آئی۔ اپس میں کچھ یا نین کہتے ہوئے اور پھر سے سونتے سونتے۔ یہ سب پھر سے سونتے سونتے کیوں ہیں؟ خوف سے؟

چلتے چلتے نظر دیوار پر گئی جماں ایک بڑا سا اشتہار لگا تھا۔ گھوڑے پر سوار کا تھا۔ میں

تلوار، صورت خونخواری، غازی یہ تیر سے پُر اسرا ریندے۔ اس پر کوئی رد عمل نہیں ہوا کہاب ذہن  
تصویر بھی مردہ بھتی اور وہ لفظ بھی۔ اگلے کمپ پر پھر وہی اشتہار، وہی تصویر، وہی لفظ۔ مردہ تصویر۔  
مردہ لفظ۔ اس کے تصویر میں ایک جلسہ گاہ کی تصویر اپھری۔ جا بجا یقین دیاں لگی ہوتیں بھنسٹیوں کی  
صورت میں بڑی طبقے اشتہارات ہوا میں ہمارتے ہوتے۔ اس وقت اس کے لفظ، اس کے نقش  
کتنے زندہ نظر آتے ہیں۔ جلسہ دعویٰ میں ویرسم ہو جاتا ہے۔ جلسہ گاہ خالی پڑی ہے۔ مگر اشتہار اسی  
صورت ہوا میں پھر پھر اس ہے میں۔ اس پر لکھے لفظ بنتے نقش کتنے مردہ نظر آتے ہیں۔ دونوں ہنگ  
ان اشتہاروں کو کوئی نہیں آتا تا پہلی بار سے موڑ گزدی یتھچے لکھا تھا کہ کہ شش انڈیا شاید کار والا  
یہ نعرہ لکھ کر بھول گیا ہے۔ نہیں تو کیا؟ اس کی سمجھیں بچھنہیں آیا۔ اصل میں  
اس وقت اس کا دماغ خالی تھا۔ دماغ بھی اور دل بھی۔ صحیح سے وہ سوچتے اور محسوس کرنے  
کی ضرورت کس شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ ابھی تک وہ سمجھنہیں پایا تھا کہ کسی بڑی ساتھ  
کوکس طور محسوس کیا جاتا ہے۔ صحیح دینک وہ کمرے میں بند بیٹھا رہا اور محسوس کرنے کی کوشش  
کرتا رہا۔ جتنا اس نے محسوس کرنے کی کوشش کی اتنی ہی اس پر بے حصی طاری ہوتی گئی۔  
پھر خواجہ صاحب آگئے اور ان کے ہلانے پر اسے ڈرائیگ روم میں جا کر بیٹھا پڑا۔ خواجہ  
صاحب کو یہ مگان رہتا تھا کہ اسے دوسروں سے زیادہ معلوم ہے آج بھی اسی مگان میں انہوں  
نے اسے بیلا یا تھا۔ مگر اسے کیا معلوم تھا؟ میں اتنا ہی جتنا دوسروں کو معلوم تھا خواجہ صاحب  
نے بھی آج اس سے زیادہ سوال نہیں کئے۔ ان کے پاس آج تو ایک ہی سوال تھا۔

”مولانا صاحب! یہ کیا ہو گیا؟“

ابا جان نے خواجہ صاحب کے رفت بھرے سوال کا جواب خنک سے بھی میں دیا:

”خواجہ صاحب! یہ دنیا دار الحساب ہے۔ انسان جو لوٹا ہے وہی کاٹتا ہے۔“

پھر خاموشی سے حقیر ہیئنے لگے۔

خواجہ صاحب چپ بیٹھے رہے۔ پھر بولے:

”مولانا صاحب! بجیں میں ریڈیوسن رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کے روئیں  
مگر میں بیٹھا آدمی، جو ان اولاد کے سامنے رفتا کیا اچھا لگتا تھا یہ ضبط کئے بیٹھا رہا۔ آخر  
اٹھ کے کمرے سے نکل گیا اور صحن میں درخت کے نیچے کرسی ٹال کے بیٹھ گیا۔ اس  
وقت آس پاس کوئی نہیں تھا۔ سب کمرے میں بیٹھے ریڈیوسن رہے تھے۔ بس بند  
لٹوٹ گیا۔“

خواجہ صاحب کی آنکھ پھر پھر آئی تھی مگر ضبط کر گئے چیز بیٹھے رہے۔ پھر ایک ٹھنڈے سے سانس کے  
سامنے لٹھے، رکے بلوے

”مولانا صاحب! میرے یہ طے کے لئے دعا کرو۔ اس کی ماں رات سے مستقل رو  
رہی ہے۔“

”خواجہ صاحب! باگھر میں کموک صبر کریں۔ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کو صبر کا صد دیتا  
ہے۔ ان اللہ مع الصابرین“، پھر اسکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ حقد الگ  
رکھا تھا۔ اسکھیں بند تھیں اور ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ انہیں تکے جارہا تھا۔ چاہا کہ اٹھ  
کر آہنسہ سے نکل جاتے گے لگ رہا تھا کہ ٹانگوں میں دم نہیں ہے۔

اب سارا دم جیسے ٹانگوں میں آ گیا تھا۔ اٹھتے ہوئے تیز تیز قدم اس گھٹی وہ ہی کچھ تھا۔  
ایک سڑک سے دوسری سڑک پر بادوسرا سڑک سے تیسرا سڑک پر۔ دیواروں پر لگے اشہار پڑھتا  
ہوا۔ لگتا تھا کہ سارا شہر کونڈا لائے گا اور شرکی دیواروں پر جتنا کچھ لکھا ہوا ہے، فرآدم پور مژوں  
کی صورت میں اور چاک اور کونک سے سکھے ہوئے نعروں اور گالیوں کی صورت میں؛ وہ سب  
پڑھ دیا لے گا۔ مگر بغیر کچھ محسوس کئے۔ لکھتے ایسے اشہاروں کو جن پر ایک ہی مضمون درج تھا  
اور کتنی ایسی کاروں کو جن کی لپشت پر شیشے پر ایک ہی نعمانگیریزی کے دو لفظوں میں لکھا  
ہوا تھا، وہ بغیر کسی اکتاہ پڑھ کے پڑھنا چلا گیا۔ لکھتے لفظ مرے پڑھے تھے۔ اسے لگا کہ تعریف نہیں  
پڑھ رہا سمجھی ہوتی تھیں پر چل رہے۔ طبیعت مالش کرنے لگی۔ دیواروں سے نظریں ہٹا

کہ اس پاس چلتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ سب کے چہرے سونت سو نتا کہ ایک سے ہو گئے تھے۔ احساس سے عاری یہس تو ف کی ایک پر چھائیں ان پر کانپ رہی تھی۔ خود بھی پر چھائیں لگ رہے تھے، جیسے ان میں وزن ہی نہ ہو۔ مجھ میں وزن ہے؟ اچانک اسے خیال آیا اور وہ شک میں پڑ گیا۔ تیر چلتے چلتے اچانک آہستہ چلتے رکا اور قدم ناپ، تول کر رکھنے لگا۔ وہ اپنے اپنے میں وزن محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وزن مجھ میں ہے کہ نہیں ہے؟ کب ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یعنی وزن ہو جاتے ہیں اور کب ایسا ہوتا ہے کہ جسم آدمی کے لئے بوجھ اور سرو بال دوش بن جلتے ہیں؟ پھر ایک رکشا اس کے قریب اکھ کھوئے کی چال چلنے لگی تھی۔ رکشا کو خالی پا کہ بے دھیانی میں بلیخی سکھا تھا کہ خیال آیا، مجھے جانا کہاں ہے؟ کہیں بھی نہیں۔ جب کہیں جانا ہوتا ہے تو ہر رکشا یہ مری نظر آتی ہے اور ہر خالی رکشا پر سے پرے دوڑتی ہوئی اور اب جب کہیں نہیں جانا تو سر پر سوار ہے "نہیں جانا، رکشا کی رفتار تیر ہوتی اور وہ آگے نکل گئی۔

اس نے تو قبڑوں کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ یہ سچل رہا تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، مگر ملکی دوڑ سمجھا ہک۔ ہر پھر کہیں کہا۔ عرفان پہلے سے موجود تھا، ساستہ چلتے کی پیالی رکھے ہوئے اور مترہ میں سکریٹ دباتے ہوئے۔

”چانتے؟“

”آج ہست چلا ہوں۔“

”کیوں؟“

”لیں دی پیسے ہی۔“

”تھک گئے ہو؟“

”نہیں۔“

”چھر؟“

”چلتے تو ہر خال بینتی ہے۔“

عرفان نے مزید آرڈر دیا۔ عبیدل نے جلد ہی چلتے لائکہ رکھ دی اور بغیر کوئی بات کئے  
واپس چلا گیا۔

وہ اور عرفان دولوں آمنے سامنے بیٹھے ایسے چلتے پی رہے تھے جیسے ایک دوسرے  
سے بالکل بے تعلق ہوں۔ چلتے پہنچتے پہنچتے اس کی نظر بیوی ہی سامنے پڑے مردے تڑے  
اخبار پہ جا پڑی اور وہیں جنم گئی۔ سب وہی خبریں تھیں اور وہی سرخیاں جو صحیح اس نے  
گھر بیٹھ کر پڑھی تھیں۔ اس وقت یہی سرخیاں اس پر دشمن کی طرح حملہ آور ہوئی تھیں۔ مگر اب  
یہ سب اتنی موٹی موٹی سستی پہنچ کرتے والی سرخیاں مردہ لفظوں کا ایک ٹھیک نظر آ رہی تھیں  
مگر کسی نہ کسی طور تو اپنے آپ کو مصروف کرنا ہی تھا بے دلی سے جہاں تھاں سرخیوں پر نظر فروختی  
ایک بخرا کو بیوی پڑھنا شروع کر دیا پڑھتا چلا گیا۔ بغیر یہ سوچ کر کیا جبر ہے؟ نظر مصروف تھی،  
ذہنی بے تعلق آخر بیزار ہو گیا۔ اخبار پہنچتے کہ کسے عرفان کو ایک لفڑ دیکھا، جس نے پیا ختم کر کے  
سگر بیٹ سلاگا لی تھی۔ اس نے بھی میز پر پڑے پکیٹ میں سے ایک سگر بیٹ نکالی اور ہونٹوں  
سے رنگا کر سلاگا لی۔

«بیارگوئی بات کہو۔»

«بات کرننا بہت ضروری ہے؟»

«ضروری تو نہیں، پھر بھی۔» یہ کہتے کہتے اس نے ارد گرد لفڑ ڈالی۔ میز میں جہاں تھاں بھری  
ہوئی تھیں۔ ایک میز پر ایک شخص اکیلا چلتے پی رہا تھا اور ساتھ میں بہت انہاں سے اخبار  
پڑھ رہا تھا۔ قریب کی دوسری میز پر ایک اور شخص چلتے پی چکا تھا اور غالباً میں گھور رہا تھا۔  
یون کے قریب ایک میز کے گرد ایک لوٹی بیٹھی تھتی۔ یا تین کمرہ ہی تھی۔ مگر دلی ویسی آوازوں میں  
ادرو قفوں کے ساتھ بیٹھراں چلتے پہنچنے والوں کے باوجود آج کتنا خاموش تھا۔

سفید سروال اور آدمی معمول کے عین مطابق داخل ہوا۔ ان کی میز کے قریب آیا، مگر پھر آتے  
آتے رستہ بدلا اور کاؤنٹر کے قریب والی اپنی پمائی میز پر جا بیٹھا۔ عبیدل قریب آگئی، «چلتے؟»

«ہاں چلتے۔»

«اوہ کچھ؟»

«اوہ کچھ نہیں۔»

عبدل نے جلد ہی چلتے لاکرہ ہن دی۔ عبدال آج جلدی عبدی سرو کر رہا تھا۔ چلتے پینے والوں سے باقیں جو نہیں کمرہ رہا تھا۔

سامنے رکھی چاتے مٹھدی ہورہی تھی اور سفید سروال آدمی سامنے دیوار کو شکے چارہ تھا۔ اچانک سرچھکا کے منڑ پر رومال لیا اور سسکیاں لے کے رونے لگا۔

جو بوجس جس میز پر بیٹھا تھا، اسی طرح اپنی یگر پر بیٹھا سفید سروالے آدمی کو خاموشی سے میکتا رہا۔

«اب، ہمیں یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔» غرفان بولا۔

«کبou؟»

«شکست پر واشتہت کی جاسکتی ہے۔ جذبائیت مجھ سے پر واشتہت ہیں ہوتی۔»

لگرا دھر سفید سروال آدمی سسکیاں لیتھیتے ایک دم سے چپ ہو گیا۔ رومال سے آنکھیں پوچھیں اور خاموشی سے چلتے پینے لگا۔

شیرات جذبائیت کے ایک حضر سے منٹا ہر سے کے بعد پھر خاموش تھا۔ یو شخص چلتے پینے کے ساتھ اخبار پڑھ رہا تھا، اب پھر چلتے پینے اور اخبار پڑھنے میں صروف تھا۔ ملا میں تکنے والے آدمی نے نئی چلتے کا آرد دیا اور اُمّظ کہ قریب کی میز پر پڑا اخبار اٹھایا اور اپنی یگر پر بیٹھ کر اسے الٹ پلٹ کرنے لگا۔ کچھ کے قریب کی میز پر باقیں کرتی ہوتی تو یہ جو دم پھر کے لئے بالکل خا موش ہو گئی تھی، پھر دبی دبی آوانوں میں باقیں کر رہی تھی۔

سلامت اور اجمل داخل ہوتے اور ان کے داخل ہوتے ہی شیرات کی خاموش فتنیاں ایک درہمی سی اگئی۔ گھور کے اسے اور عرقان کو دیکھا اور زور سے کم سیاں گھسیدٹ کر بیٹھتے

ہوتے تدوین تیر لجھے میں کہا:  
«چلتے منگا۔»

سلامت نے پہلے اسے اور پھر عرفان کو گھوڑ کے دیکھا،

«تم لوگ ہو اس شکست کے ذمہ دار،»

دولوں نے کسی بدعمل کا اطمینان نہیں کیا۔

«عرفان امیں تم سے کہہ رہا ہوں۔ تم ہو اس شکست کے ذمہ دار اور فاکر تم۔»

«کیسے؟» اس نے سادگی سے پوچھا،

سلامت نے لال پلے ہو کر کہا:

«تم سامراج کے پھٹو، تم یہو ہے جن کسرا پوچھتے ہو کیسے؟ سوچو کہ تم لوٹکوں کو کیا

پڑھاتے ہو؟ یادشاہوں کی تاریخ۔ افون کی گولیاں۔ ہاں اور تمہارا باپ

ذمہ دار ہے جو میرے باپ کو دوزمہ بہب کی افون کی ایک گولی کھلا دیتا ہے

آج بھی ایک گولی کھلاتی ہے۔ بیرا باپ آج تیر سے مزہب پرست ہاپسے

صیر کا سبقت لے کے آیا ہے۔ کہا ہے «إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ»۔ میں

نے کہا ڈھھے یہ ٹوٹکے اب تین ہمیں بچا سکتے حساب کا وقت آن پنچا ہے۔

عرفان نے لال پلے ہوئے سلامت کو سکون کے ساتھ دیکھا اور کہا:

«تو گو یا آج تم نے اپنے باپ کو اپنا باپ تسلیم کر دیا ہے۔»

سلامت نے گھوڑ کے عرفان کو دیکھا، «تم جوچہ پر طنز کر رہے ہو یہ،

«نہیں، اطمینان کا اطمینان کہہ رہا ہوں۔»

دیکھ کے قریب کی میز سے ایک نوجوان اٹھ کر آیا۔ سلامت کے قریب ہم کھڑا ہو گیا

اور تہریلے لجھے میں بولا:

«سلامت صاحب امیں تے آپ کی بارٹی کے جلسے میں آپ کی تقریبستی فتنی۔

جو آپ سے بیٹھلے دلیں کی حمایت میں کی تھی۔ آپ آج کس بات پر افسوس کر رہے ہیں؟“

”افسوس۔“ سلامت نے غصے سے کہا۔ ”افسوس کیسا؟“ میں سامراجی دلوں کو خبردار کر رہا ہوں کہ تم بازی ہار چکے ہو رہا۔“

”یعنی پاکستان بازی ہار چکا ہے؟ یہی کتنا چاہئے ہو؟“ نوجوان کی آنکھوں میں خون اُٹھا۔ آیا تھا۔

”یتھر نے دور سے بگڑتی صورت حال کو عیناً پنا، لیک کر آیا اور نوجوان کو سمجھانے لگا۔“ آپ اپنی میز پر چلیں اور چلتے پی لمبیں۔“

”نہیں مجھے ذرا پوچھ لیتے ہیں کہ یہ بھائی صاحب چاہئے کیا ہیں؟“

”یتھر نے نوجوان کو پکڑا وہ کہ کے اس کی ہدگ پر پہنچا یا۔ پھر اس کہا۔“ سلامت صاحب! آج آپ ایسی باتیں نہ کریں، لوگوں کے دل آج یہ مت دکھے ہوتے ہیں۔“

”کن لوگوں کے دل؟“ سلامت نے دانت کچکا کر کہا۔

”دیکھئے میں آپ سے سخت نہیں کروں گا۔“ یتھر نے چلتے چلتے عیدل کو پکارا۔ ”عیدل! تم سلامت صاحب کے لئے چانتے لاو۔“

عیدل کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ چلتے کی ٹھیکانے کے اس میز پر پہنچا۔

”عیدل!“ عرفان نے کھڑے ہوتے کہا۔ ”یہ چلتے میرے حساب میں جلتے گی؟“ اور سلامت کے کچھ کہنے سے پہلے عرفان اور وہ دلوں شیراز سے باہر نکل ہئے تھے۔

شیراز کے باہر فٹ پا تھے ایک ٹولی کھڑی تھی۔ اپس میں کوئی بہت گرم سخت ہو رہی تھی اور لوگ اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔ کیا سخت تھی؟ یہ وہ نہیں سن سکا۔ اس بارے ایک لفظ سنا تی دیتا تھا۔ — خدا۔ اور پھر اچانک دنو جوان ایک دوسرے پر پل پڑے

وہ اور عرفان بقیر کے، بغیر اس طرف متوجہ ہوتے آگے بڑھ لئے اور دیر تک چپ چلتے رہے پھر وہ بولا «سلامت ٹھیک کہتا تھا،»

«کیا ٹھیک کہتا تھا؟» عرفان نے بڑے ہمی سے اسے دیکھا۔

«وہ ٹھیک کہتا تھا، اس شکست کا ذمہ دار ہیں ہوں۔»

عرفان نے اسے گور کے دیکھا، پھر بولا «ذاکرہ! کہیں تم جمال عبدالناصر بنینے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟»

«نہیں، وہ کیسے بن سکتا ہوں۔ ایک معلم غریب بزدل و قرنده جاں، وہ جمال عبدالناصر کیسے بن سکتا ہے؟»

«پھر؟»

«بات یہ ہے عرفان کہ شکست بھی ایک امانت ہوتی ہے مگر اس نک میں آج سب ایک دوسرے کو الزام دے رہے ہیں اور آگے چل کر اور دیں گے۔ ہر شخص اپنے آپ کو بری الدائم ثابت کر رہا ہے اور کرے گا۔ میں نے سوچا کہ کسی نہ کسی کو یہ امانت اٹھانی چاہئے؟»

«یہاں تک تم نے صحیح سوچا، مگر اس سے آگے بھی سوچنے کی ایک بات ہے،»

«کیا؟»

«یہ کہ اس بارہ امانت کو اٹھانے کے لئے آج کی کوکم جمال عبدالناصر ہونا چاہئے،» وہ سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا «ٹھیک سمجھتے ہوں۔ امانت بڑی ہے اٹھانے والا چھوٹا ہے، اس کے بعد ایک بھی خاموشی۔ دیر تک چلتے رہے، ساکھ ساکھ مگر ایک دوسرے سے کیسے بے تعلق پھر عرفان دفتار کا «اچھا یا بے امیں چلا،»

«کمال؟ ڈیلوٹی تو ہماری رات کی ہے،»

«بس اب کل میں گے،» اور فوراً ہی دوسری سڑک پر مرٹیگا۔

اکیلا رہ جانے کے بعد اس نے اٹھیناں کا سالنیں لیا۔ عرفان ہی کی نہیں، شاید اس

کی بھی اس وقت کی ضرورت ہی نہیں۔ شاید دونوں اپنی اپنی جگہ دوسرے کو بار بھجو رہے تھے اور اکیلا ہو چانا چاہتے تھے ماتھی میں وہ پہلی بار ایک دوسرے کے لئے بار بھینتھے۔ پلتا چلا گیا، یہ سوچ بعینہ کہ کہاں جا رہے ہیں۔ ایک سگر بیٹ وائے کی دوکان پر رکا۔ کانڈار سے انہیں ملتے بغیر سگر بیٹ کا پیکٹ خریدا اور آگے بڑھ لیا۔ اصولاً اس سگر سے نکل کر نظیر اکی دوکان پر رکنا چاہیتے تھا اور وہاں سے سگر بیٹ خریدنا چاہیتے تھا کیونکہ معمداری پلی آکر ہی نہیں، مگر آج تو وہ اس راستے سے نظر اسے ایسے انکھ پچاکہ نکلا جیسے وہ اس کا مقروض ہے۔

متنہ میں سگر بیٹ دبانتے چلا جا رہا تھا کہ بناء کارڈن کے قریب سے گزرتے گزرتے ٹھٹکا۔ میں کیوں بلا وجہ اپنی ٹانگیں توڑ رہے ہوں؟ میں اس خیال کے آتے ہی وہ سڑاک سے باع میں مڑ گیا۔ روشن روشن گزرتا اس وسیع سیڑہ ناری میں پہنچا جہاں جا بجا پھولوں کے تختے شتے اور پھر کی بیچیں۔ مگر یعنی پر بیٹھنے کی بجائے اس نے سیڑہ ناری میں ٹانگیں پھیلائے کہ بیٹھنا پسند کیا۔ پھر اس نے اردوگرد نظر ڈالی۔ دور دوڑا کو کی نظر نہیں آیا۔ آج تو یا نکلن خالی ہے اور یہ سوچتے ہوتے احساس ہوا کہ وہ بے مقصد نہیں گھوم رہا تھا۔ اسے کسی تھنا گوشے کی تلاش ہتھی مگر کس لئے؟ جس لئے خواجہ صاحب کو تلاش ہتھی؟ اس خیال نے اسے چونکا دیا۔ تو گویا میں صحیح سے اس لئے ماناما را پھر رہا ہوں کہ تھا ان کا گوشہ اور میں — نہیں عرفان ٹھیک کہتا ہے۔ شکست برداشت کی جا سکتی ہے۔ جذباتیت نہیں، مگر پھر ایک دوسری روا آئی اور اسے اپنے ساتھ بھالے گئی۔ رقین القلبی کا منظاہرہ پنتزل حرکت ہے تھا ان میں جنبیات کی نکاسی عین انسانی و صفت ہے۔ اس میں مفہوم بھی کیا ہے؟ آدمی اس کے بعد ہلکا ہو چاتا ہے اور ایک دفعہ پھر اس نے اس ساتھ کے پارے میں شدتگی محسوس کرنے کی کوشش کی۔ دیگر تک بیٹھا رہا اور اپنے اور پر کیفیت طاری کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر دیٹے گیا اور انہیں موندیں۔ مگر اس ساری کوشش کے باوجود وہ ایک بے رنگی کی کیفیت کے سوا

کوئی کیفیت اپنے پہ طاری نہ کر سکا۔

« کاکے! تو یہاں کیا کہ رہا ہے؟ سورہ ہے؟»

« نہیں۔، وہ ہڑپڑکے اٹھا بیٹھا۔ سامنے افضل کھڑا تھا۔

« پھر کیا کہ رہا ہے؟» افضل گھاس پر بیٹھتے ہوتے بولا۔

« یا رسمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہ آیا تو یہاں آگئا۔ یہاں کم ازکم نہماں تو ہے اور تم کس چیز میں آتے؟»

« میں یہاں پھولوں سے کبھی کبھی ملاقات کرنے آیا کرتا ہوں۔ پھولوں سے اور درختوں سے

اپنے لوگ میں، سب اپنے یا رہیں۔»

« پھولوں سے ملاقات یا آج کے دن؟»

« ہاں آج کے دن۔، افضل چیپ ہوا، پھر لولا « یا راج منہ انہی سے میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے سوچا کہ دیکھنا چاہیے شکست کی صحیح کیسے چڑھتی ہے۔ میں نے اپنے کمرے کا دلچشہ کھولوا اور یا ہڑپڑھنے لگا۔ بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ یا ہر کچھ بھی تو نہیں تھا۔ میں نے دلچشہ بند کر لیا اور چادر منہ پر لے کے سوگیا۔ دوپہر تک سوتارہ آخیر میری نافی نے مجھے بھجنہوڑا کے اٹھایا۔ میں نے تجھ سے کبھی اپنی نافی کا ذکر کیا تھا۔

« جب، تم چلے تھے تو برسات کا موسم تھا، باڑھ آتی ہوتی تھی۔ ادھر فسادات، ادھر باڑھ۔ مگر، ہماری نافی زمین نہیں بھجوڑتی تھی۔ میری ماں نے اسے سمجھایا کہ ماں ہم تو باڑھ کی وجہ سے جا رہے ہیں، جب اُترے گی تو واپس آ جائیں گے۔ نافی میری بھولی جھانی چکنے میں آگئی۔ مگر وہ یات اس کے دماغ میں چھپنی ہوتی ہے۔ بھوڑتے بھوڑتے دنوں کے بعد تھا کہ کامکی! باڑھ اُتر گئی ہو گی، میزوں واپس لے چل۔»

« واقعی؟، وہ ہنس پڑا۔

« بالکل۔ اب تک بھی سمجھ رہی ہے کہ باڑھ اُترے گی تو ہم واپس چلے جائیں گے تو

آنچ اس نے مجھے چھبھوڑ کے اٹھایا میں آگئیں ملدا اٹھا۔ اس نے مجھے بہت پیار سے کھانا کھلایا پھر  
کشندگی کے کام کے باڑھ تو اتر گئی ہو گی۔ تو بیرون واپس نے چل پیں اس کی صورت میکنے لگا جی میں  
آیا کہ کوئی کہنا فی بیری کا کی ا پاڑھ ادھر اڑی تو ادھر چڑھ گئی۔ جانے کا است کہاں ہے ؟  
حل نہ کامت کے۔ نافی آگے سے کچھ اور پوچھ بیٹھے گی۔ بس یہاں سے تکل ہی چل تو میں نسل کھڑا  
ہوا، نسل کمیں نے سوچا کہ آج کے دن کمروہ اوگوں کے ملنے سے یہ اچھا ہے کہ چل کر درختوں  
اور بیویوں سے ملاقات کی جائے، چپ ہوا، اردوگہ و نظر ڈالی، پھر کہنے لگا، دھوپ اس وقت  
اچھی ہے مگر جا رہی ہے۔، اچھے میں افسردگی آگئی۔ دسمبر کی دھوپ اچھی ہوتی ہے۔ مگر  
جلدی ڈھل جاتی ہے۔“

افتخار ٹھیک کرتا ہے، اس نے سوچا۔ جب دل و دماغ خالی ہوں اور سوچنے اور  
محسوس کہ نے کی صلاحیت سلب ہو جاتے تو آدمی کو چاہیئے کہ درختوں کی صحبت میں ہو دیں  
بیٹھے اور بیویوں سے مہنسے رہے۔ یہ شک درخت والشمند ہوتے ہیں اور پھول اچھی باتیں  
کہتے ہیں۔ اس نے افتخار کو دیکھا کہ اس کی طرف سببے پر واد ہو کر دور کے درختوں کو  
ٹک رہا تھا۔ افتخار کی نظر وال کے ساتھ ساتھ اس کی نظریں بھی سفر کرنے لگیں اور دور کے  
درختوں پر جا کر ٹک رہیں۔ جسم دونوں کے یہاں، نظریں دور درختوں میں دل اور دماغ بھی  
وہیں پہنچے ہو سکتے۔

”کلمکے اسن“، افتخار ناز دلانہ لیجیں اس سے مخاطب ہوا۔  
وہ مشکل سے درختوں کی دنیا سے واپس آیا مگر اس واپسی پر وہ خوش نظر نہیں آتا  
تھا۔ ”ہاں کہو۔“

”پاہرا! پاکستان کا انتظام میں اپنے ناقابلے ہوں گے تو لے لوں؟“  
”کیا؟“، اس نے عجیب نظر وال سے افتخار کو دیکھا۔

”پاہرا میں سے اب یہی سوچا ہے۔ مگر دو طبق آدمی مجھے مل جائیں اور میرے یا زو۔“

بن جائیں تو یہ ذمہ داری سنبھال لوں۔ ایک تو ہے، ایک عرفان کو ملایا جاسکتا ہے کبھی کبھی  
نکد وہ باتیں کرتا ہے، پھر کبھی اچھا آدمی ہے۔ تم دو میرا ساقہ دو تو میں پاکستان کو پھر خوبصورت  
بناسکتا ہوں۔ یا رہا ان یاد صورتوں تے پاکستان کی صورت بلکار دی ہے، بہت بکروہ لوگ ہیں۔“  
وہ تبلیغ سی ہنسی ہنسا، بولا کچھ نہیں۔

”کاکے بچھے مجھ پر اعتیار نہیں ہے“، افضل یہے دماغ ہو گیا۔

”تجھ پر تو اعتیار ہے، اپنے پر اعتیار نہیں ہے۔“

”کیوں اعتیار نہیں ہے؟ یا رہاں بکروہ لوگوں کے درمیان ہم ہی تو دو خوبصورت آدمی  
ہیں۔“ رکا، پھر بولا ”تجھ پر تھے مجھے کچھ مریئے الٹھ ہونے والے ہیں۔“  
”وہ تو میں بہت دلوں سے سن رہا ہوں۔“

”یہ میں نے ہی توجہ نہیں کی تھی۔ اب کی ہے۔ الٹھ ہونے والی ہے۔ میں نے نقشہ  
تیار کر لیا ہے۔ ایک مریئے میں گلااب کے تختے ہوں گے۔“

”ایک مریئے میں؟ — کس خوشی میں؟“

”یا رہا پاکستان میں بھول بہت کم ہو گئے ہیں، جبکہ ہی تو لوگ یاد صورت ہوتے چلے جا  
نے ہیں اور نظرت پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ ان یاد نکتوں کی صورتوں کو  
مسخ ہونے سے پچایا جاتے۔ تو متصویر یہ ہے کہ ایک مریئے میں گلااب کے تختے ہوں، دو  
مریعوں میں آموں کا یاغ ہو گا۔ یا رہا بات یہ ہے کہ وہ آوازیں سی کے میری ساعت خراب  
ہو گئی ہے۔ آموں کا یاغ ہو گا تو کوئی کی آواز تو شناخت دے سے گی۔ کیوں کیا جیاں ہے؟“  
”اچھا جیاں ہے۔“

”یہ پھر تیار ہو جا، پاکستان کو خوبصورت بنانا ہے۔“

بس اسی وقت آسمان پر ایک کھڑکڑا اپٹ ہوتی۔ ایسی کہ کانوں کے پردے پھٹ  
جائیں۔ اس کی اور افضل کی دلوں کی نظریں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ ”ہوا تی حملہ،“ اس کے

ہند سے نکلا۔

وہ ہوا تی محمد، افضل تعجب سے بولا «سامن تو بولا نہیں۔»

«ہم سے سامن آج صح سے خاموش ہیں۔»

فضل آسمان کو نکلا رہا، رفتہ رفتہ فضا خاموش ہو گئی۔ افضل نے الہیناں کا سانس لیا «یار میں تو دڑ رہ تھا کہ کہیں ہیں گو لہ نہ گھر پڑے اور یہ سب بھول۔» وہ چپ ہو گیا۔

«اور تم کتنے ہو کہ پاکستان کو خوبصورت بنانا ہے۔»

«یار بجنگوں کو ہم روک نہیں سکتے؟»

فضل نے اتنی معصومیت سے پوچھا کہ وہ مہنس پڑا۔

«ذاکر، تو مہنس رہا ہے۔ میں نے سخنیدگی سے یہ سوال کیا ہے کیا ہم جنگوں کو روک نہیں سکتے؟»

«نہیں۔»

«کا کے پھر تو مجھے جانتا نہیں۔ مگر مجھے دو طیب آدمیوں کی مزدورت ہے۔ ذاکر۔»

«ہوں۔»

«تو میرا بانو بننے کا؟»

آسمان پر پھر گھوں گھوں ہونے لگی۔ آدانہ تیز ہوتے ہوتے کانوں کے پر دے پھاڑ دینے والی کھڑکھڑا ہٹ بیٹ گئی۔ آج تیسرے پھر سے جملہ کرنے والے طیارے بہت نیچے اڑ رہے تھے۔ تیزی سے آتے تھے اور گزر سے چلے جاتے تھے، بغیر گولہ کرائے۔ اس نے سامنے رکھی ٹکڑا کر کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے سات بجھنے والے تھے۔ تو گویا یہ آخری ہوا تی

لیغار ہے اور اسے یاد آیا کہ ۵۴ میں جنگ بندی کی رات کو بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ سوتے ہوتے  
میں ایک دم سے جاگ پڑا۔ مگر کسے کی دیواریں ہی رہی تھیں، کھڑکیاں اور دروازے  
جیھنچنا رہے تھے۔ میں نے گھر کی پہ نظر کی۔ بارہ بج رہے تھے۔ میں جیران ہوا اور خوفزدہ ہوا۔  
اس گھر کی تو توپوں کو خاموش ہو جانا چاہیے تھا۔ کیا جنگ بندی کا معاملہ ناکام ہو گیا  
اور جنگ دوبارہ شروع ہو گئی؟ تو پہنچ اس شور سے گرج رہی تھیں کہ چھٹی سولہ راتوں کی  
گرج اور حملہ اس کے مقابلہ میں ماند پڑ گئی۔ ایک دم سے گرج اور حملہ رک گئی۔ کامل سکوت۔ اتحاد سنٹا بھی وہ  
گرج اور حملہ نہیں تھیں بلکہ یہ تھی اور دیوالیں لرز رہی تھیں اور اب ایک دم سے تا سکوت۔ اتنا سنٹا میں ہیں  
گیا۔ شاید جنگ سے زیادہ جنگ بندی دہشت ناک ہوئی ہے۔ میں ایک دہشت سے  
نکل کر دوسرا دہشت میں سالن سے رہتا تھا۔ زیادہ گھری دہشت میں پھر میں  
صحیح تک نہ سو سکا۔

گھر کی سوتی انتیسوں منٹ سے ایک لمبا دہشت بھرا سفر کے تیسوں منٹ پر  
چاکی ہے۔ آسمان خاموش ہے۔ تو ہندوستان کے طیارے آخری بار اپنا طفظہ دکھا کر  
والپس جا چکے ہیں۔ گویا جنگ بندی ہو چکی ہے۔ میں اٹھ کر دلچسپ گھولتا ہوں، باہر جانک  
کر آسمان کو دیکھتا ہوں، فضائیں دور تک نظر دوتا ہوں۔ کچھ نظر نہیں آتا فضائیں،  
پورا شہر اندر ہیرے میں غرق ہے۔ افضل ٹھیک کتنا تھا۔ باہر کچھ بھی نہیں ہے۔  
میں دلچسپ بند کرتا ہوں اور اندر ہیرے کرے میں ٹھوٹتے ٹھوٹتے اپنے پلنگ پر آ لیتا  
ہوں۔ باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ افضل ٹھیک کتنا تھا۔ باہر سب اسی طرح ہے۔ پھر یہ سب  
کچھ کہاں ہوا ہے؟ پھر یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟ کہاں سے؟ میرے اندر سے؟  
مگر میں خود کہاں ہوں؟ یہاں یا وہاں؟ وہاں گھر سے ہوتے شہر میں؟ اور گہرائیا شہر؟ مگر گہرایا  
ہوا شہر تو میں خود ہوں۔ دل ہمارا گویا دلی شہر ہے۔ شہر جب گرتا ہے اور آدمی جب ڈھینتا  
ہے، جب کہ طبلی جوان کیڑے سے ہو جلتے ہیں اور گھر کے رکھوائے خفر تھرانے لگتے ہیں۔ اور

جب ہم تے تم سے یہ عمد لیا تھا کہ آپس میں خوبیزی مت کرنا اور اپنوں کو اپنے ملک سے مت نکانا پھر تم نے اس کا اقرار کیا تھا اور تم اس کے گواہ ہو۔ پھر وہی تم ہو کہ اپنوں کو قتل کر تے ہو اور اپنوں میں سے ایک گروہ کو ملک سے نکالتے ہو۔ قتل کیا، پھر قتل ہونے۔ زکا، پھر نکلے اور پھر جب دشیت را ہوں میں خیمہ زن ہو تو میں اور گلبیوں کے کواڑ بند ہو گئے اور گھروں سے چکی کی آواز آتی ہندہ ہو گئی اور چولہے بٹھدے ہو گئے اور جب میں قصرِ سوس میں بھا تو ایسا ہوا کہ حتانی جو میرے بھائیوں میں سے ایک ہے، وہ آیا اور میں نے اُس سے ان کا جو ایسروں میں سے باتی رہے اور پڑک رہے، حال پوچھا، ویزیر و شتم کا، اس نے کہا کہ باتی پنج جانے والے ذلت اٹھاتے ہیں اور یہ روشن کی دیوارِ قصائی ہوتی ہے اور اس کے پھائک اگ سے جلے ہیں۔ یہاں آیادِ حرب میں چکا ہے۔ بیانِ القعہ نہ یافتا، ایسِ خریب سب تکل گئے جو رہ گئے تھے وہ نکلے گئے۔ جاگیر وار پیش دار، دولت مند اہل حرقة کو فی بھی نہیں مغصل حالات لکھتے ہوتے ڈرتا ہوں۔ ملاز مانِ قلعہ پر شدت ہے اور یا ز پس اور دارو گیر میں میلا ہیں۔ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروانہ سے باہر نہیں بخی سکتا۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے ہفر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چرا غیر پڑے ہیں۔ ہے مو جزن ایک قلعہ خون کاش یہی ہو۔ وہ ایک بے کوئی کے ساتھ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں آسمکھیں بچاڑ کمراد دیکھا۔ میں کہاں ہوں؟ کہاں کہاں کس کس کی کہی ہوتی یا تین، کب کب کے قصے، میرادِ ماغ ہنسدیا کی طرح پک رہا ہے۔ پھر سوچا کہ اس سے بہتر تر یہی ہے کہ ڈائرنی لکھنے میٹھ جاؤ۔ آخر خوش جنگ تک کی ڈائرنی لکھنے کی توقیم نہیں کھائی تھی اور آج کی ڈائرنی تو ضرور لکھنی چاہیئے۔ آج کے دن کو محفوظ کر لینا چاہیئے۔ اس نے لائلین کی لوا فیخی کی اور لکھنا شروع کر دیا۔

#### ۱۸۔ دسمبر

قلیعہ معلیٰ بھائیں بھائیں کر رہا تھا، میں ہر سے بھرے شاہ کے مزار پر گیا۔ وہ مخدود بہاں نہیں تھا۔ بہت ملاش کیا، نہیں ملا۔

دلی اب ایک غارت زدہ شہر ہے۔ اور اقِ مصور یسے کوچے بکھرے پڑے ہیں کہتے ورق  
اُڑکنے، کتنوں کے نشانِ سطح کئے گھر کئے ہیں چراخ ہیں کہتے ٹھیکنے پڑے ہیں۔

میں اس خرایے سے نکلا اور لکھنؤ کی راہ چلا۔ جب تک مصلل اس شہر کے پنجا تو سن کا لکھنؤ  
کی بساطِ الٹ پکی ہے اور نواب حضرت محل اپنے جانِ شاروں کی عیمت میں شرپھوڑ کر  
نیپاں کے جنگلوں میں مکلنگتی ہیں۔ شکرِ فرنگ ان کے تعاقب میں ہے شکاری کتوں  
کی مثال انہیں بگرناگر، جنگل جنگل سونگھتا پھرتا ہے۔ میں جیران ہوا ملکنسے گیا سوچا کہ تھیا  
نہیں ڈالے۔ میں نے ملکہ کی ناصحت اندریشی پر افسوس کیا اور آگے یڑھ دیا۔

جھانسی کے نواح سے گزرتے گزرتے ایک راہرو سے پوچھا کہ جہانی اجھانسی کی  
کچھ بخوبی ہے؟ افسوس سے بولا، جہانی نے لٹکر جان دے دی۔ اجھانسی کا تختہ ہو گیا۔  
میں آگے بڑھ لیا کتنے شروں کے نواح سے گزر رہا تھا کہ کوئی ہم پایا۔ ہر مردو چے کو  
مٹھٹا اور بکھارنے والا میں پافی تھوڑا تھا، میں نے آسانی سے ندی عبور کر لی عبور کر کے آگے  
چلا تو گھٹا جنگل نظر آیا۔

### تاہیتا توپی سے ملاقات:

جنگل سے گزرتے گزرتے تاہیتا توپی سے ڈھونڈھر ہو گئی۔ وہ اس گھنے ڈراورنے جنگل  
میں ایسے نظر آتا تھا جیسے کچاہ میں تیز میں نے مودب ہوا سے شروں کا احوال سنایا۔  
”دلی کا زوال ہو چکا۔“

”پھر کیا ہوا؟“ اس نے لاپرواٹی سے جواب دیا۔

”لکھنؤ کی بھی بساطِ الٹ پکی ہے۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”جھانسی کی رانی ماری گئی۔ جھانسی کا بولو رام ہو گیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”ہندوستان جنگ ہار چکا ہے۔۔۔“

”پھر کیا ہوا۔۔۔“

”اب لڑائی سود ہے۔ مصلحت کا لفاظ اسی ہے کہ ستمیار ڈال دیتے جائیں۔ ویسے بھی بر سات گز رجھی ہے۔ نہ بدا میں پانی ڈھل چکا ہے فرنگی فوج کے رستے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔“ تانقیا توپی نے مجھے گھور کے دیکھا۔ بولا:

”میرے متراب پہلے میں ہندوستان کا تخت بچاتے کے لئے لڑ رہا تھا، اب

ہندوستان کی آتما پھلانے کے لئے لڑ رہا ہوں۔ وہ لڑاتی ہار گیا، یہ لڑاتی

نہیں ہاروں گا۔“

چبپ، ہوا مجھے غور سے دیکھا، بولا

”تم مسلمان ہو؟“

”الحمد للہ کہ میں حلقہ بگوشِ اسلام ہوں۔“

”جب ہی۔۔۔“

”اس کا مطلب؟“

”متراب مطلب اس کا لٹا ہر ہے۔ تم مسلمان لوگ اب صرف تخت کے لئے لڑتے ہو۔

لڑتے بھی کہاں ہو مجھے پتہ ہے کہ دلی کے قلعے میں کیا ہوتا رہا ہے۔“

دلی کے قلعے میں کیا ہوتا رہا ہے؟ اب اور پہلے۔ بھائیوں کے ہاتھوں بھایوں۔  
ملکوں کی زنگ آ لو تلواریں۔ مگر شہزادہ فیروز شاہ۔۔۔ اور تخت شاہ۔۔۔ وہ کس جنگیں  
ہے؟ کیا وہ بھی نیپال کے جنگلوں میں مھیک رہا ہے؟ کتنے لوگ ڈھاکہ سے نکل کر مرتے  
گئے نیپال پہنچ چکے ہیں۔ نیپال کے جنگلوں کی آغوش کشادہ ہے۔ وہ یوسرہ جھکانے  
کا شناس لے کر ماں پیختے ہیں۔ وہ جو جان بچا کر بھل گئے ہیں اور یہاں آتے ہیں کتوں نے